شہر میں شام

جاوید انور

شہر میں شام

جاوید انور

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز
۲۵۔ لوئر مال لاہور

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت
منفرد اور معیاری کتابیں
پیش کرنے والا ادارہ!

ناشر : طاہر اسلم گورا

جُملہ حقوق محفوظ

۱۹۹۱ء
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز
سے
پہلی بار
مطبع
طیب اقبال پرنٹرز
قیمت
۶۰ روپے
سرورق
امجد رفیق
تعداد
۵۰۰

امّی جی

ابّو جان

ماریہ، رِمیرا اور نورما

کے نام

فہرست

۱۔ صفرِ ہجری کی آخری شام ۱۱

۲۔ بولتا کیوں نہیں ۱۲

۳۔ تم کہو تو کہوں ۱۴

۴۔ نوزائیدہ سے خطاب ۱۶

۵۔ مرتبان کی موت ۱۸

۶۔ کتبہ ۲۰

۷۔ یہ خوابوں کا رستہ ہے ۲۱

۸۔ شہرِ سبا میں سناٹا ہے ۲۲

۹۔ کھُلے پانیوں کے نواح میں ۲۴

۱۰۔ نیا تماشہ ۲۷

۱۱۔ ایک شعر	۳۵
۱۲۔ کوئی کہانی کوئی واقعہ سُنا تو سہی	۳۶
۱۳۔ مہیب رات کے گنجان پانیوں سے نکل	۳۸
۱۴۔ نکل گلاب کی مُٹھی سے اور خوشبو بن	۴۰
۱۵۔ پھر اپنی ذات کی تیرہ حدوں سے باہر آ	۴۲
۱۶۔ اے سیلِ آب ٹھہر اب کے گردنوں تک رہ	۴۴
۱۷۔ تم دیوار بنو اور ہم در بن جائیں	۴۶
۱۸۔ ہاں بول ستارے بول	۴۸
۱۹۔ مراجعت	۵۰
۲۰۔ ایک شرمندہ نظم	۵۲
۲۱۔ بس لحظہ بھر کو	۵۵
۲۲۔ گوری ہولے ہولے چل	۵۶
۲۳۔ اپاہج دنوں کی ندامت	۵۸
۲۴۔ نوائے گمراہِ شب	۶۰
۲۵۔ عجب خوابوں سے میرا رابطہ رکھا گیا ہے	۶۲
۲۶۔ مجھے شام آئی ہے شہر میں	۶۳
۲۷۔ کس حبس کا موسم ہے	۶۶
۲۸۔ تم عجیب لڑکی ہو	۶۹
۲۹۔ وہ میرے واسطے خود کو سنبھال رکھتی ہے	۷۲
۳۰۔ چھبیسویں سالگرہ پر طویل خود کلامی	۷۳
۳۱۔ دو شعر	۸۰

۳۲ ۔ کیا دن تھے ۸۱
۳۳ ۔ بنام دوست ۸۳
۳۴ ۔ نئے سال کی پہلی نظم ۸۶
۳۵ ۔ سورجوں کا سفر ۸۷
۳۶ ۔ ایک شعر، ۹۳
۳۷ ۔ ہم اپنا آخری پتہ بھی مار آئے ہیں ۹۴
۳۸ ۔ میری تحریروں کا محور ایک بے سر فاختہ ۹۵
۳۹ ۔ فلسطینی جلاوطن کا گیت ۹۷
۴۰ ۔ ایک مصلوب آواز ۱۰۰
۴۱ ۔ ہوائے شہرِ فراق سوچا ۱۰۲
۴۲ ۔ کوئی فصیل اُٹھانا پھر اُس میں در رکھنا ۱۰۴
۴۳ ۔ ایک شعر ۱۰۶
۴۴ ۔ چلے جانا ۱۰۷
۴۵ ۔ ضیار محمود کے لئے ۱۱۰
۴۶ ۔ جلاوطن ۱۱۳
۴۷ ۔ نوحہ ۱۱۵
۴۸ ۔ سات سمندر پیچھے گھر اور ڈھلتا دن ۱۱۶
۴۹ ۔ مانا کہ میرے شہر کی تقدیر اور ہے ۱۱۸
۵۰ ۔ وہ تو سورج تھا کہ جو قتل ہوا آخرِ شب ۱۲۰
۵۱ ۔ مجھے رونا نہیں آتا ۱۲۲
۵۲ ۔ ایک غیر علامتی نظم ۱۲۴

۵۳۔ نیلما، ہیں	۱۲۶
۵۴۔ جُدائی کی پہلی نظم	۱۲۸
۵۵۔ رچی ہوئی ہیں فضائیں اُداسیاں کب سے	۱۳۰
۵۶۔ حرفِ شیریں لائے یا سنگِ ملامت لائے ہیں	۱۳۲
۵۷۔ دو شعر	۱۳۴
۵۸۔ دو شعر	۱۳۵
۵۹۔ ایک شعر	۱۳۶

صفرِ ہجری کی آخری شام

سب وِرد کر رہے ہیں، کوئی برگ ہے کہ یار

اِک اونٹنی کے پاؤں سے اُٹھتا ہوا غبار
مہتاب اُگل رہا ہے شبِ ریگزار میں!

یثرب کی ٹہنیوں پہ ستاروں کے پھول ہیں
جو آ رہے ہیں آج ہمارے رسولؐ ہیں

بولتا کیوں نہیں

تو نے کیوں اپنے گالوں پہ سرسوں ملی
تو نے کیوں اپنی آنکھوں میں چونا بھرا
تیری گویائی کس دشت کے بھیڑئیے لے گئے

بولتا کیوں نہیں

بولتا کیوں نہیں، طفلِ معصوم، تو کب سے بیمار ہے
کیسا آزار ہے، جس نے تیری شبوں سے تری نیند، تیرے دنوں سے
کھلونے چرائے،

تو سویا نہیں ہے مگر جاگتا کیوں نہیں!
دیکھتا کیوں نہیں تیرے بابا کے بالوں میں کھجلی ہے اور انگلیاں جھڑ چکی ہیں
حسابِ شب و روز کرتے ہوئے

تیری اماں کے رعشہ زدہ ہاتھ خوشحالیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے
اُن دُھلے برتنوں میں پڑے رہ گئے
صبحِ تعبیر نے شاخ پر سبز ہونے کی حسرت لکھی
آنکھ کو موتیا دے دیا!
دیکھتا کیوں نہیں آج بازار میں جشنِ افلاس ہے
شہر کی بھوک چوری ہوئی
اور خبروں نے اخبار گم کر دیا!
لوگ روتے رہے!
لوگ ہنستے رہے!
تیرے بستر پہ اشکوں کی چمپا کھلی
اور تو چُپ رہا!
تیرے ماتھے پہ مُسکان کا عطر چھڑکا گیا
اور تو چپ رہا!
میری ہنڈیا جلی
میرا چولہا بُجھا
میری جھولی سے حرفِ دعا گر گیا
میرے بچے تو لب کھولتا کیوں نہیں
بولتا کیوں نہیں!

تم کہو تو کہوں

حرف کے تار میں جتنے آنسو پروئے گئے
درد اُن سے فزوں تھا
سنو، تو کہوں
تم کہو تو کہوں ظرف کی داستاں
کھیتیوں کو گلہ بادلوں سے نہیں سورجوں سے بھی تھا
بازوؤں سے بھی تھا، ہل پکڑنے سے پہلے ہی جو تھک گئے
کشتِ زرخیز پر آب نمکین جم سا گیا
رقص تھم سا گیا
ایڑیاں گھومتے گھومتے رُک گئیں
اشک رُخسار کی گھاٹیوں پر گرا ___ منجمد ہو گیا
رنگ خوشبو بنا تو ہوا چل پڑی

خواب ناطہ بنا تو کھُلی کھڑکیوں میں سلاخیں اُگیں
ہاتھ زخمی ہوئے
کس کے کشکول سے کتنے سِکّے گرے
ہجر کیسا پرندے کی آنکھوں میں تھا
گھاؤ کیسے پہاڑوں کے سینے پہ تھے
آئینہ گنگ تھا
فرش پر عکس دھم سے گرا
کرچیاں ہوگیا
تم کہو تو گنوں
تم کہو تو چُنوں
تم کہو تو سُنوں ان کھِلے پھُول کی دھڑکنیں
گمشدہ تتلیوں کی صدا
زرد ٹہنی کے ہونٹوں پہ رکھی ہوئی بددعا
آسمانوں کی دہلیز پر پھینک دوں
تم کہو تو دکھاؤں تمہیں
اِک تماشہ کہ جو میری مٹھی میں ہے
ایک گردن کہ جو غم کے پھندے میں ہے
سانس چلتی بھی ہے اور چلتی نہیں
جاں نکلتی نہیں !

نوزائیدہ سے خطاب

یہاں سے آگے وہ راستہ ہے
کہ جس کی دہشت سے خود خداوند جاگتے ہیں
چھپے ہوئے ہیں!
پڑے ہوئے ہیں کسی ازل آشنا کھنڈر میں
فلک بچھائے
سحاب اوڑھے
یہاں سے آگے وہ راستہ ہے
کہ جس پہ انسان چل رہا ہے
کسی ستارے پہ مارٹر گن

کسی جزیرے پہ سُرخ پھولوں کی بارشیں ہیں
کسی مشین کی گراریوں میں گلاب سا ہاتھ گھومتا ہے
کسی دھوئیں میں ہیں لعل و گوہر
تمہی ہو اس راستے کے رہبر
تمہی ہو رہزن، تمہی ہو رہرو
اُٹھو کہ تم کو تمہارا رستہ
تمہارا بستہ بُلا رہا ہے

مرتبان کی موت

سفید اور سیاہ دھاریوں میں
یار، کس قدر حسین لگ رہے ہو تم !
مگر یہ حُسن اوڑھ کر
ہرے کچور گھاس کی پناہ چھوڑ کر مرے مکاں میں کیسے آ گئے
اور اب تو اس مکان کے مکین لگ رہے ہو تمُ !
یہ تم پہ کیسا در کُھلا کہ سب کے سب کواڑ بند ہو گئے
عجیب سانپ ہو
کہ پانچ ہی منٹ میں سو گئے
مرا خیال تھا یہ کانچ کی فصیل میری اور تمہاری دشمنی کے بیچ ہے

مگر یہ تُم نے کیا کیا؟
کہ اس کو قیدِ جان کر حیات ہار دی
بڑے خبیث ہو،
بڑے ذہین لگ رہے ہو تم!
مجھے تمہاری ناگہانی موت پر شدید رنج ہے

کتبہ

طائر تیرے سرہانے
اک پھول کھل رہا ہے
تیرے پروں سے بارش
تیری دھنک چُرا کر
اس کو سجا رہی ہے

طائر تری لحد پر
کتبہ نہیں تھا کوئی
کتبہ بنا رہی ہے

یہ خوابوں کا رستہ ہے ڈر جاؤ گے تم
میرے ساتھ چلو گے تو مر جاؤ گے تم

کیا ہو، بس اک زخم ہوناں، دل کے چہرے پر
وقت گزر جائے گا اور بھر جاؤ گے تم

یہ جو مٹی بالوں میں اور گالوں پر ہے
سونا بن جائے گی، جب گھر جاؤ گے تم

رُک جاؤ جاؤ یدا ابھی وقت ہے رُک جاؤ
مت کھیلو یہ کھیل، سُنو ہر جاؤ گے تم

شہرِ سبا میں سنّاٹا ہے!

اتنی آنکھیں تھیں مٹھی میں
اتنے ستارے بستے میں تھے
گنتے گنتے
گنتی بھول گئے ہم
جب ہم گھر سے نکلے!
پھر اک لذّت کی چاہت میں
ہنستے گاتے، دُھول اُڑاتے
اپنی آنکھیں، اپنے ستارے
اِدھر اُدھر کی دنیاؤں پہ نچھاور کرتے
شہرِ سبا میں پہنچے

شہرِ سبا میں سناٹا ہے
محرابی دروازوں اور منقش دیواروں کی کاہکشاں میں
صرف خلائیں گھوم رہی ہیں
اپنی آنکھیں اپنے سائے ڈھونڈ رہی ہیں
پوچھ رہی ہیں
خالی ہاتھ پہ رنگِ بصارت کب ٹھہرے گا؟
سنگِ سماعت کب پگھلے گا
شہرِ سبا! ہم تیرے سخی تھے، تیرے گدا ہیں
سارے درہم، سب دینار ترے دیدار پہ وار آئے ہیں
تیری گلی میں تیرے سلیماں تختِ سلیماں ہار آئے ہیں۔

کھلے پانیوں کے نواح میں

(جہاں ریت ہے)

کسی سیلِ نور میں بہہ گئے
وہ جہاز راں بھی، جہاز بھی
شبِ تار کا جو حصار توڑ کے آئے تھے
کھلے پانیوں کے نواح میں
ہری دھوپ میں
وہ طیور بھی جو کھلے گلاب کے روپ میں
کسی شاخ پر
تو وہ شاخ آتشِ سرخ تھی
کسی سیلِ نور میں بہہ گئی مری نظم بھی

مرے خواب بھی
وہ گناہ بھی، وہ ثواب بھی
کہ جو لوحِ خاک پہ رات بھر
کسی ماہتاب کی اُنگلیوں نے رقم کیے!
کئی برج صبحِ نجات کے
کسی سیلِ نور میں بہہ گئے تو مری خبر
ہوئی نشر تیرے مدار میں
تری ذات کے کسی منطقے میں ہوا چلی،
کھُلے بادباں
مگر اب یہاں کسی وصل کی، کسی ہجر کی کوئی یادگار نہیں بچی!
کھُلے پانیوں کے نواح میں
نہ گلاب ہیں،
نہ جہاز ہیں، نہ جہاز راں
نہ گلاس ٹوٹا ہوا کوئی
نہ شراب کا کوئی داغ ہے
یہاں صرف ریت ہے موج موج دُھلی ہوئی!
یہاں صرف ریت ہے،
ریت پر کہیں قبر ہے کسی چاند کی
جو کہ تھا کبھی!

کہیں آفتاب کے استخوان کی ریت ہے
کفِ ریگ پر کئی رنگ محوِ ترنگ ہیں
کئی نُور سال ہیں رقص میں
کسی عکس میں کوئی میں نہیں
کوئی تو نہیں

یہی ریت ہے!
یہی ریت جو کہ ازل ابد کا وصال ہے
یہ قیامتوں کا جمال ہے
تو دھنک بنی تو کرن کی اوٹ میں جا چھپی!
میں فلک بنا تو زمیں کی گود میں آ گرا
کُھلے پانیوں کے نواح میں

جہاں ریت ہے!

نیا تماشا

غرورِ قربِ خدا میں ڈوبے ہوئے فرشتے پکارتے ہیں
کہ پیٹھ ڈھانپو

یہ پیٹھ
تازہ ہیں داغ جس پر ابھی پرانی جراحتوں کے

یہ داغ ڈھانپو
کہ ان سے رستا لہو بہت اشتعال انگیز ہو رہا ہے
ہمارے پٹھے اکڑ رہے ہیں

ہمارے ہاتھوں میں تازیانے
ہماری آنکھوں سے منتقم ضابطوں کے شعلے برس رہے ہیں
ہمارے خوں کا فشار وہ سجدۂ ناگزیر ہے جو ہمیں گذشتہ بنا گیا ہے

مگر نہ بھولو کہ آج کے سر پہ بھی ہماری ہی چھتریاں ہیں
یقین جانو
برہنگی کی سزا تمہاری ہی منتظر ہے

مسیح چپ ہے
خدا فرشتوں کو ڈانٹتا ہے
اُنہیں کے ہاتھوں زمین کو پھر عذاب کے پھول بھیجتا ہے

لباس بھیجو
لباس بھیجو کہ ستر ڈھانپیں
قسم ہے دن کی
کہ شب کی چادر بھی پھٹ چکی ہے
قسم ہے فولادی گولیوں کی
کہ زخم بازار میں تماشہ بنا ہوا ہے
گلی گلی میں یہی صدا ہے
یہی سزا ہے جو گھر سے باہر قدم رکھو تو
قدم رکھو تو پتہ چلے یہ
سڑک نہیں تارکول کی دلدلیں ہیں، ڈوبو
تو پھر نہ اُبھرو!

مگر ابھی تو تمہارے جوُتے گِھسے نہیں ہیں
تمہارا کالر پھٹا نہیں ہے
ابھی تمہاری چھتوں کے نیچے ہوا بہت ہے

تم اپنی کھڑکی سے جھانکتے ہو

ہوا کی خواہش کے بار بردار
اُن مکانوں سے
جن کی نیچی چھتوں کے نیچے ہوا نہیں تھی
گلی میں آئے

یہاں گلی میں ہوا بہت ہے
مگر ہوا کی ہتھیلیوں پر نمک ہے، مرہم
کسی سمندر میں پھینک آئی ہے
شاہزادی!

مسیح تصویر ہے ــــ سدا سے
فریم کی قید کاٹتا ہے
ہجوم سڑکوں پہ ناچتا ہے!

ہجوم تاریخ کا تماشہ
ہجوم بینر، ہجوم نعرہ
ہجوم پُتلے جلا رہا ہے

ــــ ترے عجائب گھروں کی ٹھنڈک حرارتوں میں بدل رہی ہے
وہ موم آخر پگھل رہی ہے
جو تُو نے پتھر بنا رکھی تھی!

زمین کشتی نہیں تھی پھر بھی سمندروں میں اُتر گئی ہے
نہ ڈوبنے کی اِسے تمنّا
نہ تیرنے کا اِسے سلیقہ!
زمین نعروں پہ بہہ رہی ہے
ــــ زمیں یہ کف در دہاں مسافر کہ تیرے عرشے سے تھوکتے ہیں
خلا کے شفاف پانیوں میں
سدا سے معکوس مہر و مہ پہ

یہ مسخرے ہیں
نجات کی عرضیاں ابھی تک اُسی ستارے کو بھیجتے ہیں
جو دُھند کے مورچے میں ہے اور
شب کو تقدیر لکھ رہا ہے!

مسیح مصلوب ہو چکا ہے
خدا پسِ خلد رو رہا ہے
کہ ہنس رہا ہے ــ کسے خبر ہے

ہجوم چُپ ہے
ہجوم بُھوکا ہے
گالیوں سے شکم بھرے تو تمام سُکھ ہے ــــ
عجیب دُکھ ہے
انہیں سزاؤں کا دُکھ نہیں ہے
مگر یہ لقمہ
یہ آخری سانس ہے، نہ چھینو!
یہ ایک لقمہ نہ ان سے چھینو
کہ اس کی خاطر یہ ہاتھ پھینک آئے بھٹیوں میں
یہ اپنی بینائی بیچ آئے
انہیں خبر کیا کہ کون ننگا ہے
کِس نے کپڑے پہن رکھے ہیں
انہیں خبر کیا

تمہیں خبر کیا کہ موسموں کا مزاج کیسا ہے
چھاؤں کس بجاؤ بک رہی ہے
تمہاری رہداریاں معطّر
تمہارے دالان کے خس و خاک شبنمیں ہیں
تمہیں خبر کیا!
بروں بے آب جھیل ہے اور لوگ مینڈک بنے ہوئے ہیں
بہت پرے ہے وہ پارۂ ابر پیاس جس کو پکارتی ہے
بہت پرے ہے
گلے غبارہ کئے کہ چیخیں تو اپنی باچھیں ہی چیر بیٹھے
"حرامزادے ــــــ"
"ہوا، شجر، زرد زرد پتے،
دیا سلائی"
اویل راتیں، نحیف جگنو"
ہزار سرگوشیوں کی تہمت ــــــ
صدا کے بارود گھر میں شعلہ ــــــ
صدا کے بارود گھر میں شعلہ اُٹھا،
خموشی کی آگ پھیلی
گھروں کو بے قفل چھوڑ آئے ہیں، آنے والے
کسی کا باپ اور کسی کا بیٹا

کسی کی ماں اور کسی کی بیٹی فنا کی سیڑھی اُتر گئی ہے
عجیب چُپ ہے ——!

عجیب چُپ ہے ——!
صدائے نامعتبر کی مُسکان پردۂ افتخار پر معجزہ نما ہے۔
اِدھر ہے بازارِ رنگ و نکہت
اِدھر ہے قوسِ قزح کا نیلام
آؤ، آؤ،
(اور آنکھ نیلام گھر میں بینائی ڈھونڈتی ہے)
'مِلو اِنہیں یہ ملائکہ ہیں'
سفید وردی
سنہری تمغے
سیاہ محراب دار ماتھا
جمالِ گُربہ
جلالِ شاہیں
ملائکہ ہیں ——!
"ملائکہ ہیں تو ہم اِنہیں ماننے سے انکار کر رہے ہیں
یہ چھتریاں ہیں تو ہم انہیں تاننے سے انکار کر رہے ہیں
ہمارا انکار درج کر لو"

"ہمارا اقرار درج کر لو — ہم آرہے ہیں"
(صدائے معتوب چیختی ہے۔)

صدائے معتوب، مرقدِ بے نشاں کی مٹی،
نئے کھلونے
نیا تماشہ کہ سربریدہ حروف اسناد بن گئے ہیں
وہ جسم فولاد بن گئے ہیں
جو تم نے آتش کدوں میں پھینکے تھے جشن کی شب
کہ شعلۂ فتح بجھ نہ پائے
کسی سڑک پر جما ہوا بے صدا لہو تھا
کہ آج پرچم بنا ہوا ہے
شکستہ دیوار گر رہی ہے
غلام چہرے بدل رہے ہیں
صلیب ڈھانپو
تمہارے مصلوب آرہے ہیں
تمہارے مصلوب آرہے ہیں

کچھ ایسے سُر ہیں پاگل کر دیتے ہیں
جاویدؔ انور کچھ تار عجب ہیں من کے

کوئی کہانی کوئی واقعہ سُنا تو سہی
اگر ہنسا نہیں سکتا مجھے رُلا تو سہی

کسی کے ہجر کا چھلا کسی وصال کی چھاپ
بچھڑ کے مجھ سے تجھے کیا ملا دکھا تو سہی

کبھی بُلا تو سہی اپنے آستانے پر
ہمیں بھی اپنا کوئی معجزہ دکھا تو سہی

میں خود سے چھپ کے تجھے پیار کرنے آؤں گا
تو ایک بار مجھے بھول کر بلا تو سہی

کسے خبر یہیں تیرا شکار ہو جاوید
تو چند تیر اندھیرے میں ہی چلا تو سہی

مہیب رات کے گنجان پانیوں سے نکل
نئی سحر کے ستارے تو چمنیوں سے نکل

ہر ایک حد سے پرے اپنا بوریا لے جا
بدی کا نام نہ لے اور نیکیوں سے نکل

اے میرے مہر تو اُس کی چھتوں پہ آخر ہو
اے میرے ماہ تو آج اُس کی کھڑکیوں سے نکل

نکل کے دیکھ تری منتظر قطار، قطار
عزیز دانۂ گندم تو بوریوں سے نکل

تُو میری نظم کے اسرار میں ہویدا ہو
تُو میرے کشف کی نادیدہ گھاٹیوں سے نکل

اے پچھلی عمر! ادھر سوکھی پتیوں میں آ
اے اگلے سال، بُجھی موم بتیوں سے نکل

نکل گلاب کی مُٹھی سے اور خوشبو بن
میں بھاگتا ہوں ترے پیچھے اور تو جگنو بن

تُو میرے درد کی خاموش ہچکیوں میں آ
تُو میرے زخم کی تنہائیوں کا آنسو بن

میں جھیل بنتا ہوں شفاف پانیوں سے بھری
تُو دوڑ دوڑ تھکا بے قرار آہو بن

بکھر جا بن کے دھنک روز و شب کے صحرا میں
ہر ایک رنگ میں بن اور آج ہر سُو بن

تو میری رات کی تاریکیوں کو گوڑھا کر
مرے مکان کا تنہا چراغ بھی تُو بن

پھر اُس کے بعد سبھی وسعتیں ہماری ہیں
میں آنکھ بنتا ہوں جاوید اور تُو بازو بن

پھر اپنی ذات کی تیرہ حدوں سے باہر آ
تو اب تو ضبط کے اِن شعبدوں سے باہر آ

میں دیکھ لوں گا ترے اسپ، تیرے زرہ آور
بس ایک بار تو اپنی حدوں سے باہر آ

دہک دہک کے پگھلتے دنوں کے آنسو پونچھ
اذانِ گنگ، مرے گنبدوں سے باہر آ

تجھے میں غور سے دیکھوں، میں تجھ سے پیار کروں
اے میرے بُت تو مرے بتکدوں سے باہر آ

طویل اور نہ کراب وصال کی ساعت
نوائے صبحِ سفر، معبدوں سے باہر آ

تُو اب تو پھوڑ لے آنکھیں، تُو اب تو روجاوید
تُو اب تو ضبط کے ان شعبدوں سے باہر آ

اے سیلِ آب ٹھہر اَب کے گردنوں تک رہ
تنوں کی تختیاں دھونی ہیں، بس تنوں تک رہ

جہاں ہے شہر وہاں دور تک شکاری ہیں
غزل، غزال کے ہونٹوں پہ آ، بنوں تک رہ

گلی میں تاک میں بیٹھے ہیں طفل، سنگ بدست
اے میری خواہش عیّار، آنگنوں تک رہ

بہت سے کام ہیں جن سے نپٹنا باقی ہے
وصال رُت تو بڑی شے ہے، ساونوں تک رہ

ہوا میں تیر چلانے سے فائدہ جاویدؔ
تری جب آنکھیں کھُلی ہیں تو دشمنوں تک رہ

تُم دیوار بنو اور ہم در بن جائیں
آؤ دونوں مِل کے اِک گھر بن جائیں

شب بھر ہم پر اتنی وصل کی بارش ہو
دن نکلے تو ہم بھی گُلِ تر بن جائیں

ایسی نظر سے دیکھ ہمیں، اے ساحر آنکھ
جن پیروں پہ کھڑے ہیں پتھّر بن جائیں

آج کی شب ہم جاگتے ہیں، تم سو جاؤ
تم آرام کرو ، ہم بستر بن جائیں

اِک شب تم جاویدؔ ہمیں ملنے آؤ
اِک شب ہم بھی اپنے ہمسر بن جائیں

ہاں بول ستارے بول
مرا رستہ مجھ پر کھول

مرے ہجر میں نظمیں لکھ
مری یاد میں آنسو رول

میں بادِ وصال بنوں
تُو بند دریچے کھول

تُو دید کا سکہ پھینک
ہم کب سے ہیں کشکول

کیا قیمت اشکوں کی
کیا جگراتوں کا مول

چل توڑ دے شاخِ دل
چل اُڑنے کو پر تول

اب تنہا شام کی مے
جاوید دھوئیں میں گھول

مراجعت

شام ہو
عام سی شام ہو
جس کی حدبندیوں میں قفس بھی ہوں
اور آشیاں بھی
ہواؤں کی آہٹ پہ کُھلتے دریچے بھی ہوں
آئینوں میں گِھرے ننھے مُنّے پرندوں کا رقصِ دم واپسیں
ہر نفس پر بہ پر یورشِ رائیگاں

عام سی شام ہو
لیکن اس شام کے راستے میرے گھر جا رُکیں

گھر کی دہلیز پہ

میری ماں

مسکراتے ہوئے میرے گمریاں دنوں کی تھکن چوم لے

شام کی سرحدوں سے مؤذن پکارے

تو سب بھائی بہنوں کی چپ میں مری چپ بھی ہو

شام کی سیج پر باپ کے جسم سے میرے بازو اُگیں

جب منڈیروں پہ رکھے دیے جگمگانے لگیں

ٹوٹتے فرش پر میرا بھی عکس ہو

میرا بھی نام ہو

عام سی شام ہو

شام سی شام ہو!

ایک شرمندہ نظم

کن حرفوں کی تفہیم کروں
کن رنگوں کی تجسیم کروں
کس راہ چلوں اور چلتا جاؤں
کھُلا نہیں
ابھی دروازہ تو کھُلا نہیں
کس پھُول کی مدح لکھوں ؟
اے حرفِ سحر آثار، اے رنگِ آزادی !
میں نے تو نہیں دیکھا،
ترے لمس سے کونسا سنگ گلاب ہوا ،
آئینہ آب ہوا ،

کس باغ میں کونسی مشتِ خاک کھلی
خوشبو آزاد ہوئی !

میں بیس اور سات بہاریں
اور خزائیں
ایک ہی موسم کی اجرک میں دیکھ چکا ہوں
لیکن میں نے وہ دن کس دن دیکھا ہے
جب آنکھیں روزن چھوڑ کے پھولوں کی کیاری میں بس جاتی ہیں
کوئل گاتی ہے

کب کوئل گاتی ہے،
کب جھولے پڑتے ہیں باغوں میں،
چرخِ کہن سے ریزہ ریزہ وصل ٹپکتا ہے
میں نے کب دیکھا ہے
ابھی دروازہ تو کھلا نہیں !

ابھی دروازہ تو کھلا نہیں !
دروازہ کھلے تو میں بھی قلم میں تازہ ہوا کی سیاہی بھر لوں،
اور اِک خط لکھوں
میں تیرے پتے پر خط لکھوں

تو اپنا تعارف بھیج، میں تجھ پر اِک پیاری سی نظم لکھوں
کہ سُنا ہے تو بھی پیارا سا اِک لمس ہے

اِک لمحہ ہے،
لیکن میں نے تجھے کب چکھا سونگھا دیکھا سُنا محسوس کیا ہے
جب سے میں جاگا ہوں،
تو تو جنتریوں میں مورچہ بند ہے ــــــ سویا ہوا ہے!

جاگ اے نادیدہ ساعت!
اے صدیوں کا اندوہ لئے لمحے، اب مجھ پر بھی مٹھی بھر سحر چھڑک
بس ایک جھلک دکھلا!
تری ایک جھلک،
مرے پانچ حواس کی بخیہ بخیہ اُدھڑی جھولی سی بھی دے گی
بھر بھی دے گی

پھر میں تجھ پر اِک لافانی نظم لکھوں گا
تجھے سُنانے آؤں گا۔

بس لحظہ بھر کو

چلو تو ہم بھی لحظہ بھر کو
اپنے اپنے عرشوں کا سب بوجھ سروں سے گرد بھرے فرشوں پہ رکھ دیں
سُرخ شرارہ آنکھوں کی مستی میں اپنے آپ سے باہر آئیں
جان،
عقیدوں کے فولادی پھندے،
اور ہوس کے تیر کمان اِسی جنگاہ میں رکھ کے پھول چُنیں
اک دوجے کی باہوں کے رقبے میں
آنکھوں سے!
اِک عکس بنیں،
عکس بنیں ان بنتی ٹوٹتی، ٹوٹتی بنتی دنیاؤں کی جگر جگر لشکارے مارتی لہروں میں
بس لحظہ بھر کو!

ہَولے ہَولے چل

ترے سر پر گھڑا شباب کا
ترے پاؤں بندھی پائل
گوری
ہولے ہولے چل

تری ساڑھی دھانی رنگ کی
اور رستہ ہے جل تھل
گوری
ہولے ہولے چل

ترے ساتھ ہوائیں لہرائیں
تری چال چلے بادل
گوری
ہولے ہولے چل

چل پاؤں دلوں پہ رکھ کے
چل ہولے ہولے چل
گوری
ہولے ہولے چل

اپاہج دنوں کی ندامت

کھڑکیاں کھول دو
ضبط کی کھڑکیاں کھول دو
میں کِھلوں جُون کی دوپہر میں
دسمبر کی شب میں
سبھی موسموں کے کٹہرے میں اپنی نفی کا مَیں اثبات بن کر کِھلوں
خواہشوں
نیند کی جنگلی جھاڑیوں
اپنے ہی خون کی دلدلوں میں کِھلوں

بھائیوں کی پھٹی آستینوں ہیں
بہنوں کے سجدوں میں
ماں باپ کے بے زباں درد میں اَدھ جَلے سگرٹوں کا تماشا بنوں
ہر نئی صبح کے بس سٹاپوں پہ ٹھہری ہوئی لڑکیوں کی کتابوں میں
مصلوب ہونے چلوں

میں اپاہج دنوں کی ندامت بنوں
کھڑکیاں کھول دو

کھول دو کھڑکیاں
چھوڑ دو راستے
شہرِ بے خواب میں گھومنے دو مجھے
صبح سے شام تک، شام سے صبح تک
اس اندھیرے کی اِک اِک کرن چومنے دو مجھے
جس میں بیزار لمحوں کی سازش ہوئی
اور دہلوں سے نہلے بڑے ہو گئے
جس میں بے نور کرنوں کی بارش ہوئی
بحرِ شب زاد میں جو سفینے اُتارے بھنور بن گئے
خواب میں خواب کے پھول کھِلنے لگے، کھڑکیاں کھول دو
جاگنے دو مجھے

نوائے گمراہِ شب

اے خوابِ خندہ
تجھے تو میں ڈھونڈنے چلا تھا
مجھے خبر ہی نہیں تھی تو میری انگلیوں میں کھِلا ہوا ہے
مرے صدف میں ترے ہی موتی ہیں
میری جیبوں میں تیرے سِکّے کھنک رہے ہیں
نوائے گمراہِ دشتِ شب کے نجوم تیری ہتھیلیوں پر چہک رہے ہیں
مرے خلا میں تمام سمتیں ترے خلا سے اُتر رہی ہیں
مجھے خبر ہی نہ تھی
کہ میری نظر کی عینک میں تیرے شیشے جڑے ہوئے ہیں

تجھے تو میں ڈھونڈنے چلا تھا

تجھے تو میں ڈھونڈنے چلا تھا!
کسی صلیبِ کہن پہ، دار و رسن کے تاریک راستوں کی
تھکن میں، فرہادِ کوہکن کی صدائے صد چاک میں، کسی چوک
میں اُبلتے ہوئے لہو میں کِھلے گُلِ طفلِ بے گنہ کے بکھرتے رنگوں
کی اُنگلی تھامے تجھے تو میں ڈھونڈنے چلا تھا

شبِ طرب ہے
شبِ طرب میں نہ ساز اُترے نہ نُور بکھرا
نہ بادلوں نے پھوار بھیجی
نہ جھیل نے ماہتاب اگلا

شبِ طرب ہے اے خوابِ خندہ!
شبِ طرب میں مری طلب کا رباب بن جا
بُجھی رگوں میں شراب بن جا
اے خوابِ خندہ، مری انگیٹھی کا خواب بن جا
کہ شب کا آہن پگھلنے تک میری چمنیوں کے دھوئیں میں
جگنو ملہار گائیں

عجب خوابوں سے میرا رابطہ رکھا گیا ہے
مجھے سوئے ہوؤں میں جاگتا رکھا گیا ہے

وہ کوئی اور گھر تھے جن میں طیب رزق پہنچے
ہمیں تو بس قطاروں میں کھڑا رکھا گیا ہے

معطّل کر دیئے اعضاء سے اعضا کے روابط
یہاں جسموں کو آنکھوں سے جُدا رکھا گیا ہے

وہ جس پر صرف پھولوں کی دعائیں پھوٹتی ہیں
اسی مٹّی میں وہ دستِ دعا رکھا گیا ہے

مجھے شام آئی ہے شہر میں

میں سفر میں ہوں
مرے جسم پر
ہیں ہزار رنگوں کی یورشیں
کہیں سُرخ پھول کھِلا ہوا
کہیں نیل ہے
کہیں سبز رنگ ہے زہر کا
مگر آئینہ شبِ شہر کا
مری ڈھال ہے!
جو وصال ہے

وہی اصل، ہجر مثال ہے
مرے سامنے وہی راستے
وہی بام و در
وہی سنگ ہیں، وہی سولیاں
مجھے شام آئی ہے شہر میں

مجھے شام آئی ہے شہر میں
جہاں آسمان کی وسعتوں سے
سوال کاسہ بدست لوٹے تھے

یاد ہے!
شبِ حیلہ جو، تجھے یاد ہے
وہ صلیب،
جس پہ مچان، نجمِ سحر کی تھی
وہ خطیب،
جس کا خطاب ابر و ہوا سے تھا
ـــ وہ صدائے ضبط عجیب تھی
کہیں کوڑھیوں کی شفا بنی
کہیں ابر و باد سے
چوبِ خشک تڑخ رہی تھی سویر سے!

بڑی دیر سے یہاں مرقدوں کے گلاب
پاؤں کی دُھول ہیں
میں سفر میں ہوں
مجھے شام آئی ہے شہر میں
مرے ہاتھ میں بھی کمان ہے
مجھے تیر دے!

کس حبس کا موسم ہے

کِس حبس کا موسم ہے!
اس بامِ تمنّا پر
زُلفیں ہی نہیں کھُلتیں
کس جبر کا موسم ہے
آنکھیں ہی نہیں کھلتیں
زنجیر تو ہلتی ہے
آواز نہیں آتی!
ہاں، آبِ رعونت میں
اک عکس اُترتا ہے

پر چاند نہیں بنتا!
کس جبر کا موسم ہے!

کس حشر کا موسم ہے
اس شہر کے زندانی
اِک آس پہ زندہ ہیں
سانسیں بھی نہیں لیتے
پتھر بھی نہیں بنتے
کس خواب کی خواہش ہے
اُٹھتے ہیں نہ سوتے ہیں
کس درد کی لذّت ہے
ہنستے ہیں نہ روتے ہیں
کس حشر کا سکتہ ہے

اس حشر کے سکتے میں
'کب جان لہو ہو گی'
کب حرف جنم لے گا
کب شاخِ تحیّر پر
وہ پھول کِھلے گا، جو

منبر پہ سجانا ہے
کب آئے گا وہ موسم
جس کو ابھی آنا ہے
"کس دن تری شنوائی
اے دیدۂ تر ہو گی
کب ٹھہرے گا درد اے دل
کب رات بسر ہو گی"

تم عجیب لڑکی ہو

تم عجیب لڑکی ہو!
بانجھ ٹہنیوں سے بھی
خواب چنتی رہتی ہو!
خوشبوؤں کے تاگے سے
پھول کاڑھتی ہو تم
اس مریض موسم میں
جس کو خواب میں بھی اب
خواب کی تمنّا ہے!

لوگ چلتے رہتے ہیں!

اپنے در دریچوں کی
شکل بھول جاتے ہیں
ساتھ چلنے والوں کے
نام بھول جاتے ہیں
پھر بھی چلتے رہتے ہیں!

تم رُکی رُکی سی ہو
خوشبوؤں کی بستی ہیں!
ساحلوں کے رستے پر
پانیوں کی کشتی میں
آس بن کے رہتی ہو!
بھول جانے والوں کا
ساتھ بن کے چلتی ہو
تم عجیب لڑکی ہو!
خوش نصیب لڑکی ہو
مسکراتی رہتی ہو

زرد زرد ہاتھوں سے
پھول بانٹنے والی

خوش نصیب لڑکی ! سُن،
پھول بانٹنے والے
دُھول اپنے حصّے کی
اپنے پاس رکھتے ہیں!
ورنہ خواب ڈستے ہیں

وہ میرے واسطے خود کو سنبھال رکھتی ہے
مرا وہ مجھ سے زیادہ خیال رکھتی ہے

جلا کے راکھ بنا دیتی ہے، بچھڑتی نہیں
جدائیوں کو سدا کل پہ ٹال رکھتی ہے

وہ سو سو عیب سجا کر نکلتی ہے گھر سے
ہر ایک عیب میں سو سو کمال رکھتی ہے

میں اُس کی چوٹیاں چوموں کہ وادیوں میں بہوں
وہ اونچ نیچ میں یکساں جلال رکھتی ہے

چھبیسویں سالگرہ پر طویل خود کلامی

نجانے کتنے برسوں کا سفر پاؤں کے بے حس کھردرے تلوؤں میں سوزش
کا سبب ہے

عمر کی گٹھڑی کھلی تو اسلحہ تھامے ہوئے دن تھے مقابل میں
نہ شب کی موت دیکھی
اور نہ دن کی حدتیں ہی جلد پر محسوس کر پائے
سوائے چمنیوں کی سانس کے !
— ہم ہاتھ میں چھریاں لئے سہمی ہوا کو کاٹتے ہیں
برتھ ڈے کا کیک کٹتا ہے
کوئی نعرہ کوئی تالی نہیں
— خاموشیاں

بس کچھ ستارے برتھ ڈے کینڈلز بن کر جگمگاتے ہیں
ہمارے بیتے سالوں سے یہ کم ہیں یا زیادہ ہیں
ہمیں تو کوئی اندازہ نہیں ہے
ہم مہینوں اور دنوں کو دفن کر آئے ہیں
اب کیلنڈروں کا کام بس اکھڑے پلستر کو چھپانا ہے
سکولوں میں رٹی گنتی کو
ضربوں اور تقسیموں کو ہم نے عاق نامے دے دیئے ہیں
رات اور دن کا تفاوت جس نے معدوم کر ڈالا ہے
اب ہم عمر سگریٹ اور کڑک چائے کے پیالوں کی مدد سے ماپتے ہیں

یہاں جب دن نکلتا ہے
تو مائیں اپنے بیٹوں کی جرابوں پر گھروں کا راستہ لکھ کر
گلی میں پھینک دیتی ہیں
یہاں جب شام ہوتی ہے تو بستے روٹھ جاتے ہیں
یہاں منزل سے رستے روٹھ جاتے ہیں
یہ شہروں کی کہانی ہے!
یہاں اپنے ارادے ٹائی کی بندش میں لے کر چلنا پڑتا ہے
کہ ان سڑکوں پہ دو رویہ سجے شوکیس آنکھیں چھین لیتے ہیں
— مرے سب خواب میرے کوٹ کے اندر کی جیبوں میں پڑے ہیں!

یہاں سب اپنے اِک اِک ہاتھ میں ڈگری لئے
دوجے میں اُلٹا ہیٹ پکڑے
زندگی کے تار پر کرتب دکھاتے ہیں!

مگر ایسا یہاں کوئی نہیں جو ہیٹ میں سکہ ہی لڑھکا دے!
مرا دادا، جسے تعلیم کی حسرت تھی، کہتا تھا
خدا سب سے بڑا ہے، سب سے بینا ہے،
مگر بارش نہیں ہوتی!

وہ کہتا تھا مرے بچے ہوا سے خوشبوؤں کا راستہ پوچھیں، تو کہہ دینا
تو کہہ دینا کہ قبریں سانس لیتی ہیں!
انہیں کہنا زمیں جب زاویہ بدلے تو قبلے ہی بدل جائیں!
یہ سائے اپنی پیمائش
ستارے اپنی سمتیں
اور موسم سب پرانے رابطے منسوخ کر دیں!

ڈیڈ وہ دادا تھا!
اور اُس کے حاشیئے میں دو بڑی جنگوں کے دھبے تھے
اور اُس کی قبر پر اب پھول کھلتے ہیں
جو میرے گھر کے گلدانوں میں رکھے سوکھ جاتے ہیں
ستارے برتھ ڈے کینڈلز بن کر جگمگاتے ہیں!

عجب شب ہے، شبِ آخر بنی ہے!
ساری بستی رات کے معبد میں ہے
باہر اندھیری شب کی حد میں رہ کے سورج بھی نکلتا ہے
مگر سورج مکھی کا رُخ زمیں کی سمت رہتا ہے
سفر کا ایک شوقِ بے ثمر پاؤں سے سر تک کتنے ہی دردوں کے اُگنے کا بہانہ ہے
کہ سارے راستوں پر بے شباہت منزلوں کا خوف سنگِ میل ہے،
پاؤں اُٹھیں تو دو قدم پیچھے ہی جاتے ہیں
یہاں سب اپنے گھر کا قفل باہر سے چڑھا کر گھر کے اندر جاگتے ہیں
پھر بھی ڈرتے ہیں!

ہر اک دستک یہاں پر دستکِ مرگِ مسرت ہے
گھروں سے جھانک کر دیکھو تو ویرانی مثالِ نخلِ سایہ دار زندہ ہے
گلی کوچوں میں کھلتی کھڑکیاں اُس ماں کی آنکھیں ہیں
جو شب بھر پنبۂ شب کاتتی ہے
دن بناتی ہے
مگر بیٹا نہیں آتا!
گھروں میں بیبیاں مرگِ صدا کے سوگ میں چُپ ہیں
انہیں تکتے ہیں تو بچے بھی رونا بھول جاتے ہیں!

مگر اسے موت،

ہاں اے موت ہم تجھ سے نہیں ڈرتے
ہمارا خون ملوں کی چمنیوں پر اپنے اصلی رنگ میں لکھا ہوا ہے
دیکھ، ہم ہی تو مشین میں گریس کی مانند بہتے ہیں
تجھے ہم پاؤں کی ٹھوکر پہ لکھتے ہیں!
ہمیں تو زندگی سے خوف آتا ہے
زندگی،
دائرہ دائرہ زندگی،
ڈائری پام کی بڑھتی مقدار، شب، نیند، دن
دن کا آغاز ___ اخبار، باسی حروفِ تہجی
سیہ فام آزادیوں کی حکایات میں گورے کردار
آبادیوں سے پرے گندگی ڈھیر پہ باکرہ ماؤں کے
مرثیے، باپ کا خون بیٹے کے ہاتھوں،
وہی گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا
وہی پانی پہلے پلانے پہ جھگڑا،
وہی شام تک شہر کی سب بڑی چھوٹی سڑکوں
کے چکر، دفاتر کا بے فیض سا اک طواف اور
حکومت کی مہریں لگے کاغذوں کو سلام
اور خوابوں کا کہرام
اور شام

اور ڈائری پام!

لحد کے پھول کی خوشبو چمن پہ راج کرتی ہے
کسی نخلِ تمنّا پر کوئی سُورج نہیں کِھلتا
سُنا ہے سورجوں کے خواب سستے ہیں!
مگر یہ اپریل کی رات جو بس خواب جنتی ہے
گھنی دیوار تنہائی کو اب تو چاٹتی تک بھی نہیں!
خواہش
زباں سے حرف، ہاتھوں سے کمائیں چھین کر بھی خوش نہیں
گلیاں
جواں ماؤں سے پہلوٹھی کے بیٹے قرض لیتی ہیں
مگر واپس نہیں دیتیں
ہوا کے ہاتھ میں ہیں پَر،
پرندوں کے
تو آنکھیں گھونسلوں میں ہیں
اگرچہ گھونسلوں کے خواب سستے ہیں
مگر جب خواب میں بھی آندھیاں ہوں
ٹوٹتی شاخیں بکھرتے گھونسلے ہوں۔ تو ــــ!

سنو جاوید انور یہ شبِ تا ابد بھی،
یہ پھول بھی،
جو رات کی ویراں حویلی میں کھِلا ہے
اور وہ دن بھی جو اِک ریشۂ تن میں تھکاوٹ بن کے اُترا ہے
وہ سب یادیں، وہ بوڑھی فاختائیں جو تمنّا کے دہکتے ریگزاروں میں نہ جیتی
ہیں ۔۔ نہ مرتی ہیں
وہ سب پہرے جو پچھلی رات کے ویراں دریچوں میں کھِلے ہیں
سب کہانی ہے!
طلب کے دشت میں جاوید بھی سلمان بھی ہے
زید بھی، نازید بھی ہے
دید اور نادید کے وہ سلسلے ہیں جن میں سب کچھ خواب ہے
یہ راستے بھی اور مسافر بھی
لہو کے دائرے بھی رابطے بھی
سب کہانی ہے!
کہانی ہے یہ دن، یہ شب کہانی ہے
سنو، جاوید انور سب کہانی ہے!

در دریچے مقفّل کئے، کنجیاں پھینک دیں
چل پڑے اپنے کندھوں پہ اپنے بسیرے لئے

تیری خاطر مرے گرم خطے کی ٹھنڈی ہوا
سب ہری ٹہنیاں اور ان پر کھلے پھول تیرے لئے

وہ دن بھی کیا دن تھے!

وہ دن بھی کیا دن تھے
جب نیند ہماری تھی
جب خواب ہمارے تھے
وہ پھول ہمارے تھے
جو آدھی رات کے بعد کھلے
بہتے ہوئے پانی پر
وہ عکس ہمارا تھا
جو بہتا جاتا تھا
ہم گھڑیوں کی تیزی کا

روناروکرسوجاتے تھے

وقت گزرتا جاتا تھا
ہاں وقت گزر ہی جاتا ہے
سب اپنے اپنے کیلنڈر کے ساتھ لٹکتے رہتے ہیں
ہاں آئینہ تو ٹوٹ گیا
پر عکس جو آئینے کے قیدی تھے
کب سالم ہیں
کن بالوں میں ہے سُرخ ربن
کس ہاتھ میں پھول گلاب کا ہے؟

بنامِ دوست

دُور تک سمندر ہے
دُور تک کنارے ہیں
دوست تیری آنکھوں میں
رنگ آفریں منظر
خوش نما نظارے ہیں
رہنما ستارے ہیں!
تیری آنکھ کے در پر

بے شمار سمتیں ہیں
تیری آنکھ زندہ ہے!

دیکھ میرے رستے میں
اَن گنت بہاروں کی
بے نشان قبریں ہیں
بے شمار کتبے ہیں
اَن کھِلے گلابوں کے
اَن چلی ہواؤں کے
بے شمار قصے ہیں!
شُوکتے سرابوں کے
بے کنار دریا میں
اِک شکستہ کشتی پر
بادبان میرا ہے!
میں اُداس آنکھوں کے
موسموں کا رکھوالا
اَن کھُلی کتابوں کا
ایک حرف شرمندہ
زرد رُو درختوں کا

قرض ہُوں زمینوں پر!

ہجر کے مہینوں میں
جس مکاں کے زینوں پہ
گر کے کھو گئے سُورج
وہ مکان میرا ہے!

نئے سال کی پہلی نظم

نئی صبحوں کی بستی میں
یہ راتیں یاد رکھوں گا
نئے خوابوں کے رستے پر
نئی خواہش اگاؤں گا
تجھے میں بھول جاؤں گا
ادھوری رہ گئی ہیں جو
وہ باتیں یاد رکھوں گا

سورجوں کا سفر

کس نے دیوارِ صدق ڈھائی ہے
کون رمزِ دروغ سمجھا ہے
کس نے ذرّے کی وسعتیں ناپیں
کس نے دیکھی ہے تنگیٔ افلاک
اے طلوع و غروب کے مالک
اے شمال و جنوب کے مالک
راستوں کا اخیر کوئی نہیں
مُڑ کے دیکھیں تو گھر بھی غائب ہیں

عکس بے آب آئینوں میں بنا
پھول بے برگ ٹہنیوں پہ کھلے
مطلعِ صبح کے شکستہ حروف
دستاویزاتِ شب، ادھورے خطوط
طائرانِ سحر کے ہاتھ آئے
نامۂ صبح ـــــ (نغمۂ و خوشبو)
جانے کن راستوں کا رزق ہوا
منتظر آنگنوں کے دروازے
چشمِ عشاق بن گئے، لیکن
کوئی دستک نہ دی ہواؤں نے
پرچمِ دُود ہاتھ میں لے کر
چمنیوں سے سحر طلوع ہوئی!
سائرن سے درِ خروج کھُلا!

خواب آلود صبحِ درد کُشا
عکس گم کردہ خشک آنکھوں کا
تو نہیں تو شمار کون کرے!
نوحۂ برگِ زرد کون سُنے!
کون پوچھے سگِ گرسنہ سے

صحن کا راستہ، مکیں کا مزاج
اُس مکاں کا پتہ، جہاں سے اُسے
خوشبوئے نانِ تازہ آئی ہے!
کتنے دیوار و در ہیں جن سے پرے
برتنوں کو ترس گئے چولہے
آنگنوں سے دُھواں نہیں اُٹھا
کس نے لکھا دعائے اوّل میں
گریۂ طفل، صبحِ نو کے نام
بندگی قرض ہو گئی جیسے!

دُھوپ اپنی سخاوتیں لائی
تیری کاسہ نواز راہوں پر
کوچۂ مہرباں، تہی داماں
لوگ اپنی شہادتیں لائے
خواہشِ حرفِ معتبر لے کر
ہم گنہ گارِ آرزو نکلے
ہم طلب گارِ آگہی نکلے
حرف بکتے رہے سرِ بازار
آنے والے دنوں کے وصف گذار

ہدیۂ آفتاب سانھ لئے
مدرسوں کی طرف روانہ ہوئے
نانِ شب کی جہد میں ایک ہجوم
دفتروں اور ملوں کی سمت گیا
زندگی فـــرض ہو گئی جیسے!

بحرِ بے حد میں کشتیاں ہم تم
جن پہ گھڑیوں کے بادبان لگے
صبح سے شام کی طرف یونہی
سوئیاں کھینچتی رہیں ہم کو!
منزلوں کی تلاش میں ہم لوگ
حاصلِ عمر، بے ثمر اسناد
دستِ شاہاں کے دستخط لے کر
شاہراہوں سے خواب چُنتے ہیں
مدرسوں میں شباب جلتا ہے
خواہشیں دفتروں میں پلتی ہیں
خون جلتا ہے کارخانوں میں
دیدۂ شوق کو ترســتا ہے
حسُن ویراں نگارخانوں میں!

اسمِ اعظم چھپا دیا کس نے
بھیک میں دے کے ایک حرفِ تہی
دولتِ شوق چھین لی کس نے
جو گھروں سے ضیائیں لائے تھے
چند نابینا حرف اُٹھائے ہوئے
مدرسوں سے وہ کور چشم چلے
خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے
دفتروں اور کارخانوں سے
وعدہ و خواب فردا ساتھ لئے
سب گھروں کی طرف روانہ ہوئے
کون تعویذِ رہبری لایا!
منبروں سے اُتر کے کون آیا!

دیکھ، اے شامِ شہر، دیکھ ادھر
شاخیں بے برگ، آئینے بے آب
وہمِ عکس و شبیہہ گل بھی نہیں!
دن ڈھلے تک کھُلی نہ رمزِ سحر
چھپ گیا آفتابِ مینا بدوش
نشۂ آرزو بھڑک اُٹھا

مرقدِ آفتاب پر دیکھیں
کون پہلا دیا جلاتا ہے
کون اب مے بدست آتا ہے

سنو کہ اب ہم گلاب دیں گے گلاب لیں گے
محبّتوں میں کوئی خسارہ نہیں چلے گا

ہم اپنا آخری پتّہ بھی مار آئے ہیں
ہنسو، کہ خواب بھی ہم لوگ ہار آئے ہیں

کہیں کوئی در و دیوار و بام ان کے لئے
زمین دیکھ ترے بے دیار آئے ہیں

جنہیں عزیز تھی اپنے لہو کی حُرمت وہ
ترے دیئے ہوئے تمغے اتار آئے ہیں

میری تحریروں کا محور ایک بے سر فاختہ
میرا نعرہ خامشی، میرا پیمبر فاختہ

ایک آنگن قہقہوں اور سسکیوں سے بے خبر
چھت پہ اک پرچم پھٹا سا اور دم پر فاختہ

تیرے رستوں کی رکاوٹ شاخ اک زیتون کی
تیرے ایوانوں کے اندر جاگتا ڈر فاختہ

شام، پیاری شام، اس پر بھی کوئی در کھول دے
شاخ پر بیٹھی ہوئی ہے ایک بے گھر فاختہ

ایک جانب اُجلے پانی کا بلاوہ اور ہوا
دوسری سمت اِک اکیلی اور بے پر فاختہ

فلسطینی جلاوطن کا گیت

میں جانتا ہوں
کہ سیک میں اسلحہ کے ہمراہ گالیوں اور ٹھوکروں کی کڑی شرائط ہیں
دیکھتا ہوں میں اُن کو جن کے گلے پٹوں میں ہیں
اور بندوق نرم بستر پہ سو رہی ہے
اُداس مت ہو مرے فلسطیں
ابھی تو میری رگوں میں بہتی تمازتیں تیری حرمتوں کا غلاف ہیں
میری ساری سمتیں ترے بدن پر لکھی ہوئی ہیں
تجھی سے ہوں میں

میں تیری عریانیوں کو اپنے لہو کی چادر سے ڈھانپ لوں گا
اُداس مت ہو،
دُعا کا تعویز میں نے صحرا میں گُم کیا ہے!

خدا اگر ہے تو آ کے دیکھے
زمیں خداؤں سے بھر گئی ہے!
زمیں خداؤں میں بٹ رہی ہے!
ہماری آنکھوں پر اپنے حصّے کے پھُول تکنا بھی جرُم ہے
اُن گھروں میں رکھی صراحیاں ہم کو رو رہی ہیں
کہ جن کے دروازے ہم پہ کھُلتے ہیں تو دھماکے
چھتوں کو فرشِ اُداس تر کے سپرد کرتے ہیں
آنسوؤں کا ہجوم ہے اور ہم
کہ رونا بھُلا چکے ہیں!

اُداس مت ہو
میں اپنے پیروں سے منزلوں کا سراغ پاؤں گا
میرے ہاتھوں پہ منزلوں کا ظہور ہو گا
غلیظ ہاتھوں نے تیرے فرشوں پہ جو لکھی ہے
ہر اُس عبادت کا قتل واجب ہوا ہے مجھ پر!

میں اپنی بینائی دے کے تجھ کو اُجال دوں گا
اُداس مت ہو
میں لوٹ آؤں گا اے فلسطیں
تو میرے اُجڑے گھروں میں لیٹی اداس بیلوں میں اپنی آنکھیں سجائے رکھنا!

ایک مصلوب آواز

FREEDOM AND INDEPENDENCE
COME ONLY THROUGH A BARREL
OF THE GUN. YOU HAVE TO
SNATCH IT, NOT BEG FOR IT.

مقبول بٹ

میں سورج ہوں
اور رات کی کوکھ سے پھوٹتی رات کو ہار منوا کے پیدا ہوا ہوں
میں کشمیر، افریقہ، کمپوچیا، ویت نام اور فلسطین میں پیدا ہوا ہوں
اذاں میرے کانوں میں بندوق سے دی گئی ہے
سنو، تم کہ جو میری ہی بہتری کے لئے
میرے اپنے صحتمند اعضاء کو مجھ سے جدا کر رہے ہو

مجھے میری ہی زندگی سود پر قرض میں دینے والو، سنو
میں تمہارے سبھی فیصلے مانتا تو ہوں
لیکن
مجھے حکم سننے کی عادت نہیں ہے
مجھے زخم سہنے کی عادت نہیں ہے
تم اخبار کی آنکھ میں اپنے آنسو سجاؤ
میں بم کی زباں سے تمہارے بیانوں پہ ہنستا رہوں گا
سنو، قہقہوں کی دھنوں پر تمہارے سبھی ماتمی گیت
میری سماعت میں محفوظ ہیں
میں یو۔این کی آرام دہ کرسیوں میں سجے کارٹونوں کو پہچانتا ہوں
میں سب جانتا ہوں
وہ جو فائلوں میں ہے
اور وہ بھی جو چند کمروں میں سرگوشیوں تک ہی محدود ہے
اب میں اپنے سبھی فیصلے خود کروں گا
کہ میرے بدن پر لگے زخم اب گولیوں کو جنم دے رہے ہیں
سنو، اب میں بندوق کی آنکھ سے دیکھتا ہوں!

ہوائے شہرِ فراق سوچا!

گزرتے لمحوں کی کہکشاں میں
جو اپنی آنکھوں کے چور رستوں سے ایک ہی رنگ دیکھتا تھا
وہ مِٹتے رنگوں میں سوچکا ہے!
کنوارے رستوں پہ چلنے والا
کہ تتلیوں اور جگنوؤں کی تلاش میں تھا
خمارِ عہدِ گداز بھی ساتھ لے گیا ہے
نہ اب سہریسہ کی سلطنت ہے
نہ کوئی احمد شمیم ہے اب

ہوائے شہرِ فراق اب تیری دستکیں کس کے واسطے ہیں
کہ زرد مٹی کی نبض پر جس کا ہاتھ تھا اُس کا گھر
ادھوری شبوں، مشینوں میں کچلے نامرد سورجوں کی پہنچ سے باہر ہے
تو بھی سوچا!
ہوائے شہرِ فراق سوچا!!

کوئی فصیل اُٹھانا پھر اس میں در رکھنا
بڑا عذاب ہوا خواہشِ سفر رکھنا

حقوق ضبط ہوئے سب بحقِ عدل ہوا
کھُلی فضاؤں میں رہنا، نہ بال و پر رکھنا

نصیب جاگے تو اُن کے جو سو رہے تھے ابھی
ہنر ہوا ہے یہاں دستِ بے ہُنر رکھنا

نگر میں آ کے پرندے نہ بے نگر ٹھہریں
مکاں بنانا تو آنگن میں اک شجر رکھنا

ہوا کا حرف مقدّم سہی مگر جاوید
"کوئی چراغ تو دیوارِ شہر پر رکھنا

گھوم پھر کے شام کو پنجروں میں واپس آگئے
اے پرندو، اپنے اپنے گھر کی راہیں کیوں نہ لیں

چلے جانا

چلے جانا،
مگر ٹھہرو ذرا
اس پیڑ کی سرگوشیاں سُن لو
یہ کہتا ہے
کہ آگے دُھوپ ہے، تم میری چھاؤں ساتھ لے جاؤ
ہرے موسم جب آئیں گے
میں تم کو خوشبوئیں بھیجوں گا
میری شاخ آنکھیں برگ آنسو روئیں گی
میں جانتا ہوں
جب ہوا ہی پر بنے تو پھر پرندے روکنے سے رُک نہیں پاتے

چلے جانا
مگر ٹھہرو ذرا
یہ لان تم کو یاد کرتا ہے
یہاں سرما کا سورج اور ہمارے گیت کی لے آج تنہا ہے
تمہارے قہقہوں کے پھول سوکھی ٹہنیوں پہ جھولتے ہیں
تتلیاں باسی دھنوں پر رقص کرتی ہیں
صدائیں بجھ گئی ہیں
دُور تک یہ دھوپ بھی دستِ دعا ہے
اور ہوائیں نرم لفظوں کی طرح کوئی دعا تشکیل دیتی ہیں!

چلے جانا،
مگر ٹھہرو ذرا
یہ در یہ دیواریں جدائی کی لغت ہیں
ان پہ لکھے لفظ تو پڑھ لو
کہ اِن بوسیدہ دیواروں کی آنکھوں میں تمہارے عکس روشن ہیں
انہیں اچھی طرح دیکھو
کہ اِک دِن تمُ انہیں عکسوں کی جانب لوٹنا چاہو گے
لیکن واپسی کے سارے رستے بند پاؤ گے

چلے جانا،
مگر ٹھہرو ذرا
پر کیا؟
چلو جاؤ
خدا حافظ — !

ضیاء محمود کے لئے

گھروں سے دُور تنہائی
جہاں پر اجنبی در د آشنا محسوس ہوتے ہیں
اُداسی دُھند ہے جس میں
میں اک تنہا ستارہ جاگتا ہوں
جانتا بھی ہوں کہ ملنا تو بچھڑنے کے سفر کی ابتداء ہے
پھر بھی افسردہ ہوں
روتا ہوں!
وہ منظر سوچ کر جب ہاتھ ملتے ہیں
فقط جب ہاتھ ملتے ہیں

زباں اور آنکھ کے رشتے جہاں مفلوج ہوتے ہیں
اچانک روشنی رفتار سے بھی تیز، اندھے ذہن میں اک فلم چلتی ہے
وہ اک لمحہ،
کہ جب سارے قلم سُستی ہی سُستی
لفظ بے معنی
صدا بچّے کے ہاتھوں سے چُھٹا گیسی غبارہ ہے
مگر تو پھر بھی کہتا ہے
میں کچھ لکھوں!
میں کچھ بولوں!

شبیہیں ریزہ ریزہ آنکھ کے پردے پہ آتی ہیں
تو اشکوں میں بدلتی ہیں

وہ گرمی کا مہینہ تھا
کڑی دوپہر تھی، تو نے کہ تو بھی اُس جگہ پر اجنبی تھا
میرے ہاتھوں سے مرا سب بوجھ لے کر اجنبی رہ پر شناسائی کا سب سے
پہلا سنگِ میل اُگایا تھا
پھر اُس کے بعد موسم گھومتے تھے اور ہم مرکز تھے
ہاتھوں میں کتابیں بوجھ تھیں

جسموں میں بس کچھ اَن کہے جذبے تھے
خوں کب تھا
شرارت کی چمک تھی جو کہ چہروں پر دہکتی تھی!

مگر اب تو اُداسی ہی اُداسی ہے
فقط یادیں ہی یادیں ہیں
خدا حافظ بھی اب کیسے کہوں تم کو
کہ اب تو ہونٹ بھی ہلتے نہیں ہیں
ہاتھ بھی ہلتے نہیں!

جلاوطن

تری تو زندگی چیش اور سگرٹ سے عبارت تھی
تری آنکھوں کی بہکی نیند میں بھی پھول کھلتے تھے
تجھے تو نفرتوں سے بھی محبت تھی
کہ مائک پر ترے الفاظ ایٹم بم بھی تھے
سورج میں کھلتے پھول بھی تھے
تیرا گھر لفظوں کی گہرائی میں تھا:

پر آج تو خاموشیوں کا گیروی چوغہ پہن کر
بے شباہت سے کسی برگد کی چھاؤں میں

ہوا کی تختیوں پر
دوستوں کے نام اچھے لفظ لکھتا ہے !

مجھے معلوم ہے
موسم درختوں کی جڑوں میں بھی بدلتے ہیں
مگر تو میرے بہرے عہد کا گونگا پیمبر ہے !

نوحہ

وڈھے بھا، کا

اِک تُو کہ ساری عمر ہنساتا رہا ہمیں
اِک ہم کہ تیرے واسطے رو بھی نہیں سکے

سات سمندر پیچھے گھر اور ڈھلتا دن
بے منزل رستوں کا سفر اور ڈھلتا دن

کھیت میں بے رزقی کے خواب اور تعبیریں
اپنے خون سے بوجھل پر اور ڈھلتا دن

سڑکوں پر اک گونگا شور اور تنہا میں
سر کے بوجھ سے جھکی کمر اور ڈھلتا دن

پھٹتی خالی جیبیں اور مردہ آنکھیں
بھوک شکنجے میں یہ نگر اور ڈھلتا دن

پھٹنے کو ہے دل، وہ ناآسودگیاں!
گھر جانے کی خواہش ڈر اور ڈھلتا دن

مانا کہ میرے شہر کی تقدیر اور ہے
پر تیرے خواب اور ہیں تعبیر اور ہے

چہرے تو سب وہی ہیں، وہی شور ہے مگر
اب کے اسی ہجوم میں تقریر اور ہے

اس بار شاہراہوں نے لکھا ہے فیصلہ
اس بار ہاتھ اور ہیں زنجیر اور ہے

یہ پوسٹر ہیں زخموں پہ پھاہے رکھے ہوئے
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر اور ہے

جاوید آؤ سڑکوں کو مائیں کہیں کہ اب
خستہ چھتوں کی آنکھ میں تصویر اور ہے

وہ تو سُورج تھا کہ جو قتل ہوا آخرِ شب
بے گناہی کی ملی اُس کو سزا آخرِ شب

اپنے دامن میں چھپائے ہوئے اُس کی خوشبو
چیختی پھرتی ہے گلیوں میں ہوا آخرِ شب

آسماں کوئی ستارا ہی اُگل ہم سے تو
رات نے چھین لیا راہ نما آخرِ شب

سونے والا ہے جہاں سارے کا سارا لیکن
جاگنے والا ہوں یا میں یا خُدا آخرِ شب

کون تھا جس نے ہمارے لئے جاوید انور
تختۂ دار پہ مانگی تھی دُعا آخرِ شب

مجھے رونا نہیں آتا

اپاہج فیصلے، جھوٹی گواہی، بے گنہ مجرم
سلاخیں شاہراہوں پر
کٹہرے میں عدالت بین کرتی ہے
مرے ٹی وی کی ہیروئن ترے دُرّوں سے ڈرتی ہے
مرا ہیرو تری سولی پہ ہنستا ہے
میں رونا بھول جاتا ہوں
وہ مجرم ہے اور اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے
وہ مجرم ہے بدلتی آنکھ کے تیور نہ پڑھ پایا

ستارے بے جہت ، بے انت شب، سُولی اکیلی ہے
مرا ہیرو پسِ دیوارِ شب آنسو بہاتا ہے
سگِ آزاد کل سے آج تک اخبار پر پیشاب کرتا ہے
مجھے رونا نہیں آتا ،

ایک غیر علامتی نظم

ادھوری لڑکیو،

تم اپنے کمروں میں پُرانے سال کے بوسیدہ کیلنڈر سجا کر سوچتی ہو
یہ بدن عمروں کی سازش میں نہ آئیں گے
تمہیں کس نے بتایا ہے
گھڑی کی سوئیوں کو روکنے سے دوڑتا اور ہانپتا سُورج مثالِ نقشِ پا
افلاک پر جم جائے گا
تمہیں معلوم ہے عریانیوں کو ڈھانپ کر تم اور عریاں ہو رہی ہو
روزاِن آنکھوں کی تکڑی میں تمہارے جسم تُلتے ہیں
ہر اک شب ہاسٹل میں تاش کی بازی میں تُم کو جیت کر اِک جشن ہوتا ہے

ہماری خواب گاہوں میں تمہارے خواب روشن ہیں
چلی آؤ،
کہ باہر برف ہے
اور اب ہمیں تم سے جُدا البستر کہاں تسلیم کرتے ہیں
چلی آؤ کہ عمریں رائیگاں ہونے سے بچ جائیں!

نیلما، مَیں

نیلما، میں محبت کا بُھوکا ہوں، مجھ سے محبت کرو
میری ماں نے مجھے اُس زمیں پر جنا ہے
جو بے آسماں ہے
مرے چار سُو اک سمندر ہے محرومیوں کا
مرا گھر بہت پیچھے ہے
اور آگے سفر ہی سفر ہے
مجھے اپنے کندھوں پہ بیمار ماں، بوڑھے باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا
وہ بارِ گراں بھی اُٹھا کر ہے چلنا
جو صحرا میں سُورج کی چھتری کے نیچے پڑا ہے

مگر پاؤں چلنے سے مُنکر!
مری نیلما،
تمُ مرا بوجھ بے شک نہ بانٹو،
مجھے اپنے پاؤں پہ چلنا سکھا دو
مجھے حوصلہ دو!
مجھے پیار دو!

جُدائی کی پہلی نظم

کیا خبر تھی نئے سال کی ڈائری پر بچھڑنے کی تاریخ لکھنا پڑے گی،
مرے پاس آ، دیکھ، میری گھڑی کے تو ڈائل پہ بھی کوئی ہندسہ نہیں ہے
فقط تیرے ہی مختلف نقش لکھے ہوئے ہیں، میں جب وقت تکتا ہوں تو
سوئیاں مجھ کو بیتے ہوئے موسموں کی طرف کھینچتی ہیں

چل مرے ساتھ تو بھی انہیں موسموں میں، کہ جب دھوپ اور ہم اکٹھے نکلتے
تھے اور شام تک راستوں پر لکھے، اپنے یاروں کی پیشانیوں پر سجے زائچوں میں
سے اپنے مقدر کی تحریر پڑھتے تھے اور راہ چلتی حسیں لڑکیوں کی اداؤں میں اُن
کی چھپی خواہشیں سونگھ کر کامیابی کے کلیے بناتے

یوں بہاروں میں پتّوں کا گرنا شگون کوئی اچھا نہیں ہے !

اب بچھڑتے ہوئے میرے ہونٹوں پہ تیرے لئے ڈھیر ساری دعائیں ہیں، مولا کرے یہ اخیری جدائی ہو تیری، مگر جب بھی برسات ہو پہلی بارش ترے دلِ شجر پہ مرا نام پھر سے لکھے !

رچی ہوئی ہیں فضا میں اُداسیاں کب سے
پڑی ہیں لان میں دو خالی کُرسیاں کب سے

کئی نگاہیں اُسے چومنے کو دوڑی ہیں
پکڑ رہی ہے جو رنگین تتلیاں کب سے

زمانے بیت چلے اور کوئی نہیں آیا
گھری ہیں بوڑھی کتابوں میں لڑکیاں کب سے

مجھے بلاتے ہیں سب اُس کا نام لے لے کر
ستا رہی ہیں اُسے بھی سہیلیاں کب سے

حصارِ آب میں اک بوند کے لئے جاویدؔ
کھُلی ہیں سطحِ سمندر پہ سیپیاں کب سے

حرفِ شیریں لائے یا سنگِ ملامت لائے ہیں
ہم تو اُن سب کے گھروں میں پھول دے کر آئے ہیں

دستکیں دیں بھی تو لوگوں کو جگانے کے لئے
مدعی بتلائے ہم نے ہاتھ کب پھیلائے ہیں

خواب اِن آنکھوں میں بھی تھے آگ اس خوں میں بھی تھی
جانے کیا کچھ تھا جو ہم نذرِ سفر کر آئے ہیں

ہم ذرا خاموش اور خود دار تھے ناں اجنبی
زخم جو سب نے سجائے ہم چھپا کر لائے ہیں

گر کبھی فرصت ملے تو اس طرف بھی دیکھنا
اس طرف بھی گل کھلے ہیں اس طرف بھی سائے ہیں

جانے والے اب یہاں تیری نشانی بھی نہیں
تو ہی رو اب میری آنکھوں میں تو پانی بھی نہیں

بچپنوں کی حد پھلانگی تو کہاں پر آ گئے
یہ بڑھاپا بھی نہیں ہے یہ جوانی بھی نہیں

ڈرائیں گی تجھے دیواریں جی کڑا رکھنا
میں لوٹ آؤں گا، اے ماں یہ در کھلا رکھنا

مسافروں کا مقدّر ہوا چلے کہ رُکے
تمہارا کام چھتوں پر دیئے جلا رکھنا

پانی پہ تیرتی رہیں بچوں کی تختیاں
اُن پر لکھے بزرگوں کے اقوال بہہ گئے